Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 3, Issue 3
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ڈاکٹر سید شیراز علی زیدی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

علامہ اقبال کی تعلیمی خدمات اور تصورِ تعلیم کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ

Dr. Syed Shiraz Ali Zaidi
Assistant Professor, Department of Iqbal Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad

AS AN EDUCATIONIST ALLAMA IQBAL'S SERVISES AND CONCEPT OF EDUCATON: A RESEARCH AND EXPLANATORY STUDY

Allama Iqbal was a great thinker, philosopher, poet as well as an educationist. He started his career as McLeod Arabic reader on 13 May 1899 at the University of Punjab. As MacLeod Arabic reader he translated, compiled, and write books and research articles on different subjects. During the same period, he taught English literature in Islamia college and Govt college Lahore respectively for six months after taking unpaid leave from the university of Punjab. After expiry of his contract as Mcleod Arabic reader at Punjab University he joined Government college Lahore in June 1903 as assistant professor of Philosophy. In 1905 he went to Europe on study leave to pursue the Bar at Law and PhD. Although before he returns from Europe in 1908, he resigned from his job as a teacher. But he continued teaching students in college and universities on the requests of the institutions. He also compiled textbooks of various subjects and was associated with management committees of educational institutes. Allama Iqbal closely observed the eastern and western systems of education and criticizes both due to their shortcomings. Based on his experiences and observation he had the ideas about the education of Indians specially Muslims, which are expressed in his various writings. Iqbal's services and ideas as an educationist have been little discussed. In this article a research and explanatory review of Iqbal's services and concepts as an educationist have been made.

Key words: Iqbal, education, concepts ،Philosophy

 Corresponding Author's Email: shiraz.ali@aiou.edu.pk

علامہ محمد اقبال کی نظریات اور افکار کی کئی جہتیں ہیں جن میں ان کا تعلیمی تفکر بطور خاص توجہ کا متقاضی ہے۔ انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ایک معلم کے طور پر کیا اور مشرقی و مغرب نظام ہائے تعلیم کا گہرے مطالعے کے بعد اپنے نظریات وضع کیے۔ فلسفے میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے دو سال کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں ریسرچ فیلو کے طور پر علامہ اقبال کا تقرر ہوا۔ اس ملازمت کے فرائض میں اورینٹل کالج میں تدریس، علمی موضوعات پر کتب کی تالیف و ترجمہ اور عربی مطبوعات کا اہتمام شامل تھا۔ اقبال نے اس زمانے میں انٹر میڈیٹ کے طلباء کو تاریخ، علم سیاستِ مدن، نفسیات اور استخراجی منطق پڑھا کر تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ تصنیف و تالیف میں عبدالکریم الجیلی کی کتاب "توحید مطلق کا نظریہ" پر ایک تحقیقی مضمون "بمبئی اینٹی کویری" کے ستمبر ۱۹۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسٹبز کی کتاب Early Plantagenets اور واکر کی تصنیف Political Economy کا اردو ترجمہ مع حواشی و تعلیقات کیا۔ لیڈ کی Primer of Psychology کے اردو ترجمے پر نظر ثانی کی۔ اس دور کا سب سے بڑا کارنامہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایما پر اقتصادیات جیسے اہم موضوع پر "علم الاقتصاد" کے عنوان سے ۱۹۰۳ء میں ایک کتاب تالیف کرنا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ شیخ عبدالقادر کے مشہور مجلے "مخزن" میں علامہ کے تین مضامین "بچوں کی تعلیم و تربیت"، اردو زبان۔ ڈاکٹر وائٹ بریخت کے انگریزی مضمون کا ترجمہ" اور "اردو زبان پنجاب میں" جنوری ۱۹۰۲، ستمبر ۱۹۰۲ء اور اکتوبر ۱۹۰۲ کے شماروں میں بل ترتیب شائع ہوئے۔(۱)

۱۹۰۱ء میں انھوں نے یونیورسٹی سے بلا رخصت تنخواہ لے کے انھوں نے اسلامیہ کالج میں شیخ عبدالقادر کی رخصت کے دوران چھ مہینے انگریزی ادبیات پڑھائی۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید رجوان دنوں اس کالج میں ایف اے کے طالب علم تھے علامہ کے طریق تدریس کے بارے میں بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ علامہ انھیں نصاب میں شامل ایک کتاب Seekers After God یعنی متلاشیان حق، پڑھایا کرتے تھے۔ اس کتاب میں قبل از مسیح کے تین حکیموں کی سرگزشتیں درج تھیں اور عیسائی مصنف نے ان کا موازنہ انجیل کی آیات سے کیا تھا۔ عبدالسلام خورشید کے بقول:

> "علامہ مرحوم نے کلام پاک کی ان آیات سے ان اقوال کی تشریح کی جو ان کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں۔ موازنے کے دوران آپ یہ بھی ثابت کرتے جاتے تھے کہ قرآن پاک کی آیات ان اقوال سے بدرجہا افضل اور بہر نوع اکمل ہیں۔ اسلامیہ کالج کی چند روزہ پروفیسری نے ہی آپ کے تبحر علمی کا سکہ بٹھا دیا۔"(۲)

اس کے بعد چھ مہینے کے لیے گورنمنٹ کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر انگریزی پڑھائی اور میکلوڈ عربک ریڈر کی ملازمت ختم ہونے پر جون ۱۹۰۳ء میں اسی کالج میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اسی ملازمت کے دوران ان کا ایک اہم مضمون "قومی زندگی" ماہ نامہ "مخزن" میں اکتوبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون پر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ تشریف لے گئے۔ لندن میں قیام کے آخری دنوں میں انھوں نے لندن یونیورسٹی میں عربی زبان کی تدریس کی اور اس کے علاوہ اسلامی تہذیب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا۔ خواجہ حسن نظامی کے نام ایک خط مرقومہ ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء میں اقبال نے ان لیکچروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک لیکچر ہو چکا ہے دوسرا اسلامی تصوف کے موضوع پر ہو گا۔ فروری کے تیسرے ہفتے میں "مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر"، "اسلامی جمہوریت"، "اسلام اور عقلِ انسانی" وغیرہ کے عنوانات سے لیکچر ہوں گے۔ انھی دنوں میں ان کا ایک مضمون Islam and Khilafat کے عنوان سے لندن کے سوشیالوجیکل ری ویو میں شائع ہوا اور اسی سال لوزاک کمپنی لندن نے ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ Development of Metaphysics in Persia (ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات کا ارتقا) شائع کر دیا جس کا ترجمہ بعد ازاں "فلسفہ عجم" کے نام سے میر حسن الدین نے کیا۔ (۳) اس مقالے میں اقبال نے عجمی صوفیا کے افکار کا جائزہ پیش کیا ہے۔

اقبال نے یورپ سے واپس آنے سے قبل ہی گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا تھا اور اس کے بعد انھوں نے پیشے کے اعتبار سے وکالت کو ترجیح دی۔ اپریل ۱۹۰۹ء میں انھیں گورنمنٹ کالج میں تاریخ اور بعد ازاں علی گڑھ کالج میں فلسفے کے پروفیسر کی پیش کش ہوئی مگر انھوں نے قبول نہیں کی۔ اس دوران یکم مئی ۱۹۰۹ء کو گورنمنٹ کالج کے فلسفے کے پروفیسر جیمز کی اچانک وفات کی وجہ سے انھوں نے پنجاب گورنمنٹ کی درخواست پر عارضی طور پر فلسفے کی پروفیسری قبول کی مگر اس شرط پر کہ یہ ذمے داری ان کی وکالت پر اثر انداز نہ ہو۔ یہاں بھی اقبال نے اپنے شاگردوں میں خوب مقبولیت حاصل کی۔ ان کے پڑھانے کا انداز بل کل میر حسن کا سا تھا۔ (۴)

تاہم اقبال کی نظر میں تعلیم و تعلم محض کسی کالج یا جامعہ کی نوکری تک محدود نہیں تھا۔ انھوں نے باقاعدہ ملازمت نہیں کی مگر اپنے خطبات، مضامین اور لیکچرز کے ذریعے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں اور مدراس، حیدر آباد، بنگلور، میسور، علی گڑھ اور بین الاقوامی انجمنوں کی دعوت پر ان کے خطبات اور مختلف مجلوں میں شائع ہونے والے مضامین اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پنجاب یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں کے رکن بھی رہے۔ میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے کے لیے فلسفہ، تاریخ، فارسی اور ایل ایل بی، سول سروس امتحانات کے

پرچے مرتب کیے۔پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ بھی علی گڑھ اور الہ آباد کی جامعات کے مختلف امتحانوں میں ممتحن کی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے مختلف جماعتوں کے لیے اردو، فارسی کی نصابی کتب بھی مرتب کیں۔

ان کی نثر و نظم پر گہری نظر ڈالی جائے تو اس میں بچوں سے لے کر جوانوں اور بزرگوں تک کی تعلیم و تربیت کا ایک خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ نظامِ تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کے سلسلے میں اقبال کی شہرت اس پائے کو پہنچ چکی تھی کہ نہ صرف ہندوستان کے تعلیمی اداروں کی پالیسیوں میں ان سے مشاورت کی جاتی بل کہ تعلیم و تعلم کے نظام کو مرتب کرنے کے لیے افغانستان کے شاہ نے بھی آپ کو افغانستان آنے کی دعوت دی جسے آپ نے قبول کیا۔

اقبال اگرچہ ان معنوں میں ماہر تعلیم نہیں تھے کہ انھوں نے تعلیم اور نظام تعلیم کے بارے میں کوئی باقاعدہ کتاب مرتب کی ہو۔ اقبال اور تعلیم کے حوالے سے سامنے آنے والے تمام تحقیقی و توضیحی مواد میں ان کے جملہ شعری و نثری رشحات سے اخذ و استفادہ کرتے ہوئے تعلیم و تعلم کے بارے میں ان کے نظریات پر مجموعی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے مگر انھیں اس بڑے اور وسیع مفہوم میں بجا طور پر ماہر تعلیم قرار دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تعلیمی نظام کی نظریہ سازی کا کام کیا ہے یعنی انھوں نے تعلیمی نظام کے لیے ایک بنیادی ڈھانچہ فراہم کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کن خطوط اور اصولوں پر استوار ہونی چاہیے۔ انھوں نے اپنی مرتبہ کتب میں بھی ہر جماعت کے طالب علموں کے لیے ان ہی اصولوں کو برتا اور اس کی نشاندہی بھی فرمائی۔

اقبال نے چھٹی ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے اردو کی نصابی کتب حکیم شجاع احمد کے تعاون سے ترتیب دیں۔ یہ کتابیں گلاب چند اینڈ کپور سنز نے لاہور سے ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۰ء میں شائع کیں۔ تینوں کتابوں میں ایک ہی دیباچہ شامل کیا گیا ہے۔ ایک کتاب گورنمنٹ کالج کے تاریخ کے پروفیسر لالہ رام پرشاد کے تعاون سے "تاریخ ہند" کے نام سے مرتب کی جو پہلی مرتبہ شیخ گلاب علی اینڈ سنز لاہور نے ۱۹۱۳ء میں شائع کی۔ "آئینہ عجم" کے عنوان سے فارسی نظم و نثر پر مبنی ایک کتاب دسویں جماعت کے طلبا کے لیے مرتب کی جو ۱۹۳۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ "انتخاب نکاتِ بیدل" کے عنوان سے ایک کتاب بی اے فارسی کے لیے ترتیب دی جو ۱۹۳۲ء میں لاہور سے طبع ہوئی۔(۵) رفیع الدین ہاشمی نے پانچویں جماعت کے اردو نصاب کے لیے مرتب کی گئی ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۲۸ء میں مرتب کی گئی اور اس کتاب کی دیباچہ بھی اردو کی دیگر مذکور کتب سے الگ ہے۔ یہ کتابیں کس مقصد اور اصول کے تحت مرتب کی گئی ہیں اس کے متعلق دیباچے میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب میں ایسے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جو زندگی کا روشن پہلو دکھائیں اور جن کے مطالعے سے طلباء کشاکشِ حیات میں زیادہ سے زیادہ استقلال، خودداری اور دیانت داری سے حصہ لینے کے قابل

ہو سکیں۔ کیوں کہ ادبیات کی تعلیم صرف ادبی ذوق کی تربیت ہی نہیں بل کہ طلباء میں وسیع النظری پیدا کرنا اور دل و دماغ کی صلاحیتوں کو پوری طرح نکھارنا بھی ہے۔ مضامین کے انتخاب کے سلسلے میں دیباچے میں مزید بتایا گیا ہے کہ:

"اخلاقی مضامین کے انتخاب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ان کا اسلوبِ بیان ایسا ہو جو طالب علم کو کمزور اور بزدل بنانے کی بجائے نیک اور بہادر بنائے اور اس امر کا لحاظ تو بل خصوص رکھا گیا ہے کہ منتخبہ نظم و نثر پر وطنیت کا رنگ غالب ہو تا کہ طلباء کے دلوں میں اخلاقِ حسنہ اور علم و ادب کی تحصیل کے دوران میں اپنے وطن کی محبت کا پاک جذبہ موجزن ہو۔"(۷)

مذکور نصابی کتب علامہ اقبال کی یورپ سے وطن واپسی کے بعد مرتب کی گئی ہیں۔ اس دیباچے سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولفین کا مقصد طلباء میں غیرت، خود داری، بہادری اور زندگی سے مقابلے کی قوت پیدا کرنا ہے، وہیں اس بات کی بھی تردید ہوتی ہے کہ اقبال وطن سے محبت کے مخالف تھے کیوں کہ کوئی قوم جب تک اپنے وطن سے مخلص نہ ہو وہ ترقی نہیں کر سکتی ہے۔ اقبال کی تعلیمات میں وطن سے محبت اور وطنیت یا وطن پرستی کا نظریہ دو الگ چیزیں ہیں۔ ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو بڑی قومیں آباد تھیں۔ اسلام نے قومیت کی بنیاد مابعد الطبیعاتی عقائد پر رکھی ہے جس کے مطابق توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور ختم نبوت پر یقین رکھنے والا ہر شخص بلا تفریق وطن اور نسل اسلامی قومیت میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس دیگر اقوام نے اپنی قومیت کے نظریے کی بنیاد جغرافیائی وطنیت اور نسل پر استوار کی ہے اور یہ ایک طرح کی بت پرستی کے زمرے میں آتی ہے۔ اسی لیے وطن پرستی کا نظریہ اور وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل اقبال کے نکتہ نظر سے اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ تاہم جس جگہ کوئی جنم لیتا اور زندگی گزارا تا ہے اس کی محبت کا دل میں پیدا ہو جانا فطری ہے۔ لیکن اسلامی نکتہ نظر سے نظریاتی طور پر اس وطن کا محافظ اور جاں نثار اسی وقت بن سکتا ہے جب اس وطن میں اس کے اعتقادات محفوظ ہوں اور اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں ایک اسلامی دیس ہی مسلمان کا نظریاتی وطن ہو سکتا ہے جو اس کی اسلامی قومیت کی بنیاد کے مستحکم ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی مذکور کتب کے دیباچے سے اقتباسات نقل کرنے کے بعد اپنا تجزیہ درج ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"ان اقتباسات کے مطالعے سے واضح ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک منتخبہ نظم و نثر ایسی ہونی چاہیے جس سے طلباء پر اخلاقی اثرات مرتب ہوں اور مضامین، کہانیوں اور

نظموں کو پڑھ کر ان کے دلوں میں وسعتِ نظر، ہم دردی، خودداری، نیکی، بہادری، دیانت داری، احساسِ فرض اور امید و روشنی کے جذبات پیدا ہوں۔ تینوں کتابوں کی نگارشات اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر منتخب کی گئی ہیں۔"(۸)

مصورِ پاکستان کی نگرانی میں ترتیب دی گئی نصابی کتب اور ان کے مقاصد کی روشنی میں ہمیں اپنی موجودہ نصابی ادبی کتب پر محتاط نظر ثانی بھی کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ علامہ محمد اقبال نصابی کتب کی تالیف کے لیے کس قدر تردد کیا کرتے تھے اور ان کا مطمح نظر کیا ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ پروفیسر محمد اکبر منیر کے نام ان کے خط مرقومہ ۳۰ جنوری ۱۹۲۲ء سے باآسانی لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے "آئینہء عجم" کی تالیف کے سلسلے میں تحریر کیا تھا۔ اس خط سے درج ذیل اقتباس دیکھتے چلیے۔ یہ اقتباس رفیع الدین ہاشمی نے بھی "تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" کے ص:۱۷۔۱۸ پر "اقبال نامہ" جلد دوم کے حوالے سے دیا ہے مگر میں مظفر برنی کی مرتبہ کلیات کی دوسری جلد سے نقل کر رہا ہوں:

"عرصہ سے میرا ارادہ ایک انٹرنس کورس فارسی ترتیب دینے کا ہے۔ جدید فارسی نظم ونثر کے کچھ عمدہ اور آسان نمونے مل جائیں تو یہاں کے طلباء کے لیے نہایت مفید ہو گا۔ اگر آپ کو چند ایسی کتب نظم ونثر مل جائیں تو میرے لیے خرید کر لیجیے۔ نظمیں مشہور اساتذہء حال کی ہوں اور سلیس اور آسان طرزِ جدید میں لکھی گئی ہوں تو زیادہ مناسب ہے۔ پولیٹیکل نظموں کی ضرورت نہیں۔ ایک کتاب 'سفینہء طالبی' سنا ہے بہت اچھی ہے مگر ہندوستان میں دستیاب نہیں۔ یہ کتاب یا کوئی اور کتاب اسی قسم کی مل جائے تو خوب ہے۔ غرض کہ آپ یہاں کے انٹرنس کے طلباء کی ضروریات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ میرا مقصود یہ ہے کہ فارسی کے ذریعے سے بھی جدید خیالات اور احساسات طلباء ہند تک پہنچیں۔ انگریزی کورسوں میں مضامین کا تنوع نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ انتخاب میں وہ بھی زیرِ نظر رہے۔"(۹)

درج بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال نصابی کتب کی ترتیب کے حوالے سے کس درجہ محتاط رہتے اور کتنا تردد کیا کرتے تھے۔ اس اقتباس سے جو نکات سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اقبال طالب علموں کی ذہنی سطح کے مطابق ایسی نگارشات کو منتخب کرتے تھے جو آسانی ان کی سمجھ میں آجائیں۔ ان کی نظر انتخاب مشاہیر معاصر اساتذہ کی

جدید طرز میں لکھی نظم و نثر پر پڑتی تھی۔ اس کے لیے وہ انگریزی کی نصابی کتابوں کے نمونوں کو بھی پیش نظر رکھتے تھے اور معیاری ادب کی تلاش کے لیے بین الاقومی طور پر بھی رابطے کرتے تھے۔

یہاں علامہ اقبال کے تصوراتِ تعلیم کو سمجھنے کے لیے دو اہم مضامین "بچوں کی تعلیم و تربیت" اور "قومی زندگی" کا انتخاب کیا گیا۔ "بچوں کی تعلیم و تربیت" ۱۹۰۲ء میں "مخزن" میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں علامہ اقبال نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان کی ذہنی سطح کے مطابق نصاب تعلیم مرتب کرنے پر زور دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قوائے عقلیہ و ذہنیہ کے مدارج کو سامنے رکھتے ہوئے نصاب تعلیم مرتب نہ کرنے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے بل کہ ان کی ذہنی قوتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کو قومی ترقی کے عروج کی جڑ قرار دیتے ہوئے بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے چند ایسے اصول پیش کیے ہیں جن کے مطابق بچوں کے لیے درس و تدریس کا اہتمام اور نصاب سازی ہونی چاہیے۔ عالم طفلی میں بچوں کی نفسیات کے عمیق مطالعے کے بعد انھوں نے مثالوں کے ساتھ گیارہ نکات پیش کیے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ بچوں میں اضطراری حرکت کا رجحان پایا جاتا ہے اور یہ حالت انسان اور حیوان میں یکساں پائی جاتی ہے۔ بچوں کے اعصاب کی یہ زائد قوت رونے چلانے، ہنسنے کھیلنے اور چیزوں کو ادھر ادھر پھینکنے میں ضائع ہو جاتی ہے۔ اساتذہ بچوں کی طفلانہ حرکتوں سے بھی تعلیمی فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔۔ جیسے کہ اینٹوں کے گھر بنانا، لڑی میں منکے پرونا، گانا وغیرہ۔ بچے کے وہ اعصابی قویٰ جو رونے اور بے جا شور میں ضائع ہوتے ہیں انھیں ایک باقاعدہ راگ میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور وہ قوت جو نقان دہ چیزوں کے چھونے یا دیگر اشیا کو ادھر ادھر پھینکنے میں خرچ ہوتی ہے، اسے اینٹوں کے گھر بنانے میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے کہنے کا مقصد ہے کہ بچے کی اضافی اعصابی قوت کو کام میں لا کر تربیت کا آغاز ہی سے عملی اور تجرباتی ہونا چاہیے۔

۲۔ بچہ کسی چیز پر مسلسل توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتا کیوں کہ جس طرح وہ جسمانی طور پر بے چینی کا اظہار کرتا ہے اسی طرح اس کی عقلی قوت بھی مضطرب رہتی ہے۔ اس لیے طریق تعلیم میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اسباق طویل نہ ہوں، یعنی سبق چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے پڑھائے جائیں اور ہر سبق میں کوئی خاص بات مشترک ہونی چاہیے تا کہ اس خاص مقام پر توجہ دینے کی عادت بھی پڑتی جائے۔

۳۔ بچے کو اشیاء کے چھونے میں لطف محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے جس شے کے متعلق سبق دیا جائے وہ بچے کے سامنے رکھی جائے اور سبق ختم ہونے کے بعد اس کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ مشاہدے سے بصری حس اور چھونے سے

قوتِ لامسہ کو فروغ ملتا ہے۔ گفتگو اور راگ سے سماعت کی قوت ترقی پاتی ہے۔ اس طرح بصارت اور لمس کی قوت کے ایک ساتھ استعمال سے کسی شے کا ادراک بچے کے لیے بے حد آسان ہو جائے گا۔

۴۔ بچے کو کسی شے کے رنگوں میں بے حد کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ شوخ اور چمکیلی چیزوں کی طرف لپکتا ہے۔ اگر کوئی مصور اعلیٰ درجے کی ایسی تصویر بنائے جس کے رنگ شوخ نہ ہوں تو بچہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے گا۔ اس کی نسبت رنگین تصاویر والی چھوٹی سی کتاب بھی اس کی توجہ فوری حاصل کر لے گی۔ بول چال میں بھی وہ نیلا، پیلا، لال وغیرہ مربع، تکون وغیرہ کی نسبت آسانی سے سیکھ لیتا ہے۔ اس سے یہ اصول سامنے آتا ہے کہ بچے کو ابتدائی سبق رنگین چیزوں کے متعلق دیے جائیں۔

۵۔ بچہ نقال ہوتا ہے اور نقل کرنے میں اسے مزا آتا ہے۔ معلم کو چاہیے کہ اس کے سامنے عمدہ نمونے پیش کرے اور اس سلسلے میں خود معلم کی اپنی مثال سب سے بہتر ہے۔

۶۔ بچوں میں قوتِ متخیلہ یا واہمہ بھی نمایاں ہوتی ہے۔ بچہ چڑیا چڑے کی کہانی بہت شوق سے سنتا ہے۔ اکثر بچے اسکولوں میں کاغذ کی کشتیاں اور دن رات وغیرہ بناتے ہیں جو قوتِ متخیلہ کے لیے ایک اچھی مشق ہے۔ اس قوت کی متوازن تربیت کرنی چاہیے۔

۷۔ بچوں میں ہمدری کی حس بہت زیادہ موجود ہوتی ہے۔ معلم کو چاہیے کہ ہمدردی کے متعلق بچے کو اچھی اچھی کہانیاں یاد کرائے اور اگر کسی جانور کے بارے میں سبق پڑھا رہا ہو تو خود بھی اس جانور سے اچھے سلوک کی مثال دے، یعنی اس کی تربیت عملی مثال سے کی جائے۔

۸۔ بچے کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے۔ اس کی ترقی کے لیے استاد کو چاہیے کہ وہ طالب علم کو اچھے اچھے شعر اور نظمیں یاد کرائے اور جو سبق پڑھائے ان کے نکات بار بار دہرائے۔

۹۔ بچپن میں چیزوں میں تمیز کرنے کی قوت کمزور ہوتی ہے۔ بچے باریک فرق نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے شروع میں باریک اور مبہم اختلافات کی بجائے واضح اور بڑے اختلافات کی طرف توجہ دلائی جانی چاہیے اور مختلف اشیاء کے تقابل سے اختلافات کو واضح کیا جانا چاہیے۔

۱۰۔ بچپن میں عقل کی قوتیں جیسے کہ استدلال، تصدیق، اثبات، نفی وغیرہ کمزور ہوتی ہیں۔ مثلاً بچے کو معلوم نہیں کہ حب وطن کیا شے ہے۔ اس لیے ان کی نشو و نما بتدریج کی جانی چاہیے۔ جو باتیں ابھی بچے کے تجربے میں نہیں آئیں وہ

پڑھانا بچے کے ذہن پر بے جا بوجھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ خیال رکھنا ضروری ہے کہ بچے کے مدرکات، تصورات اور استدلالات اس کے علم کے انداز کے ساتھ ساتھ درجہ بدرجہ ترقی کریں۔

۱۱۔ بچے اخلاقی تحریکوں سے بہت جلد متاثر نہیں ہوتے۔ بچوں میں اخلاقی اوصاف پیدا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس لیے استاد کو چاہیے کہ ابتداء ہی سے اس کی طرف خاص توجہ مرکوز کرے۔ (۱۰)

درج بالا نکات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال بچے کو ایک متحرک اور فعال قوت سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بچے کے جسم کی طرح اس کا ذہن بھی متحرک اور فعال ہو۔ بچے میں جستجو کا مادہ فطری طور پر ہے جس کو ابھار کر چیزوں پر غور و فکر اور مشاہدے کے نتیجے میں چیزوں کو درست طور پر سمجھنے کی قوت کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ بچہ اگرچہ ابتدا میں نقال ہے مگر تخلیق وجدت بھی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اس لیے معلم کا فرض ہے کہ وہ ایسا نصاب ترتیب دے اور پڑھانے کے ایسے طریقے پر عمل کرے جس سے اس کی تمام صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہو۔

"قومی زندگی" ۱۹۰۴ء میں "مخزن" میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی زندگی کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس مضمون کا آغاز اقبال نے فلسفہ ارتقاء اور بقاے دوام کے اصولوں کی روشنی میں قوموں کے عروج زوال کے جائزے سے کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اپنی معاشرتی و معاشی منصوبہ بندی کرے اور اس میں نظام تعلیم ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ کے نزدیک تعلیم عام کے ذریعے اہل ہند معاشرتی اور معاشی طور پر ترقی کی منازل طے کر سکتے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق تعلیم کا پہلا کام اخلاقی حالت کو بہتر بنانا ہے تاکہ ان معاشرتی برائیوں کا خاتمہ ہو سکے جو سماجی ترقی کی راہ میں حائل ہیں جیسے کہ نا رضامندی کی شادیاں، تعدد ازدواج کے معاملات، نمود و نمائش اور مختلف قسم کی رسموں میں بے جا اسراف۔ تعلیمی پالیسیوں کے سلسلے میں انھوں نے اہل جاپان کو بہت سراہا ہے جنھوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لیا ہے اور اپنے تعلیمی نظام میں صنعت و حرفت کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان کا انحصار صرف زراعت پر ہے اور اس کا کام دوسرے ملکوں کے لیے خام مال پیدا کرنا ہے۔

اقبال نے تعلیمی منصوبہ بندی میں اس بات پر زور دیا ہے قومی تعلیم کی بنیاد انقلابی حالات کے سبب پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ یعنی تعلیم بامقصد ہو اس میں صنعت و تجارت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو۔ علامہ نے اہل جاپان کی حیرت انگیز ترقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ تیس چالیس سال پہلے یہ قوم تقریباً مردوں جیسی زندگی گزار رہی تھی۔ ۱۸۶۸ء میں جاپان میں پہلی تعلیمی مجلس قائم ہوئی اور اس کے صرف چار سال کے بعد ۱۸۷۲ء

میں جاپان کا پہلا تعلیمی قانون شائع ہو گیا جس میں شہنشاہ جاپان نے تعلیم کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا اب سے ملک میں تعلیم اس قدر عام ہو کہ جزیرے کے کسی گاؤں یا قصبے میں بھی کوئی خاندان جاہل نہ رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف ۳۶ سال کے مختصر عرصے میں اس قوم نے جو مذہبی طور پر ہندوستان کی شاگرد تھی، دنیاوی طور پر اہل مغرب کی تقلید کر کے ایسی شاندار ترقی کی کہ دنیا کی سب سے زیادہ مہذب قوموں میں شمار ہونے لگی۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں:

> "جاپانیوں کی باریک بین نظر نے اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت کو دیکھ لیا اور وہ راہ اختیار کی جو ان کی قومی بقا کے لیے ضروری تھی۔ افراد کے دل و دماغ دفعتاً بدل گئے اور تعلیم و اصلاحِ تمدن نے قوم کی قوم کو اور سے کچھ اور بنا دیا اور چوں کہ ایشیا کی قوموں میں جاپان نے رموزِ حیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے، اس واسطے یہ ملک دنیوی اعتبار سے ہمارے لیے سب سے اچھا نمونہ ہے، ہمیں لازم ہے کہ اس قوم کے فوری تغیر کے اسباب پر غور کریں اور جہاں تک ہمارے ملکی حالات کی رو سے ممکن و مناسب ہو اس جزیرے کی تقلید سے فائدہ اٹھائیں۔"(۱۱)

اقبال نے تعلیمی نظام میں صنعت و حرفت پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے ہندوستان کی معاشی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ہمارا ملک دوسرے ممالک کے لیے خام مال کا ایک گودام ہے اور ہماری ضرورت کی ہر چیز غیر ممالک کی صنعتوں کی مرہون منت ہے۔ جب کہ جدید دور میں صرف زراعت پر انحصار کر کے کوئی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اب اس صورت حال میں دیکھا جائے تو نوجوان صنعت سے گھبراتے اور حرفت کو عار سمجھتے ہیں۔ علامہ کا خیال ہے کہ اگر ہم جاپان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جو اس وقت ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے تو ہمیں اس وقت اصلاحِ تمدن اور عام تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ تعلیمی معاملات پر بحث کرتے ہوئے اقبال کا موقف ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کا مقصد بل عموم صرف اور صرف دماغی تربیت لیا ہے لیکن میری فکر کے مطابق تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں میں ایسی قابلیت پیدا کرنا ہے جس سے ان میں بطریق احسن اپنی معاشرتی ذمے داریاں پوری کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

اس سے مراد یہ نہیں کہ جو اذہان فطری طور پر علمی تحقیقات کا رجحان رکھتے ہیں ان کی نشو و نما کو روک دیا جائے ۔ بل کہ مجموعی طور قومی تعلیم کی بنیاد انقلابِ حالات کی وجہ سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں پر ہونی چاہیے اور اس بات کو سب سے پہلے جاپانیوں نے سمجھا اور اپنے ملک کی صنعت کو ترقی دی۔ معاشی ترقی کی اس جنگ میں مسلح سپاہی وہ ہنر مند ہیں جو اپنے ملک کے کارخانوں میں خاموشی سے کام کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں اگر کسی قوم کی قوت کا اندازہ لگانا ہو تو توپوں اور

بندوقوں سے نہیں بل کہ کارخانوں سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ قوم اپنی ضروریات کہاں تک اپنی محنت سے حاصل کرتی ہے اور کہاں تک دوسروں کی محتاج ہے۔ علامہ رقم طراز ہیں:

> "ان حالات کو مدِ نظر رکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو تعلیم کی تمام شاخوں سے زیادہ صنعت کی تعلیم پر زور دینا چاہیے۔ واقعات کی رُو سے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو قوم تعلیم کی اس نہایت ضروری شاخ کی طرف توجہ نہ کرے گی وہ یقیناً ذلیل و خوار ہوتی جائے گی۔۔۔ میں صنعت و حرفت کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت خیال کرتا ہوں اور اگر میرے دل سے پوچھو تو سچ کہتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس بڑھئی کے ہاتھ جو تیشے کے متواتر استعمال سے کھردرے ہوگئے ہیں ان نرم نرم ہاتھوں کی نسبت بدرجہا خوب صورت اور مفید ہیں جنھوں نے قلم کے سوا کسی اور چیز کی بوجھ کبھی محسوس نہیں کیا۔"(۱۲)

مذکور مضمون سے جو اہم نکات سامنے آئے ہیں ان کے مطابق علامہ نے جاپان کی صنعتی ترقی کا راز تمدنی اصلاح اور نظام تعلیم کی بہترین پالیسی میں دریافت کیا ہے۔ تمدن کا معاشی حالات پر بھی خاصا اثر ہوتا ہے مثال کے طور پر ذرائع آمدن محدود ہونے کے باوجود تعدد ازدواج، شادیوں، فوتگیوں وغیرہ کی رسموں میں اصراف، دکھاوا نمائش میں پیسے کا زیاں، کام چوری، صنعت و حرفت کو عار سمجھنا۔ علامہ کے نزدیک اصلاح تمدن کا معاملہ مذہب کے ساتھ جڑا ہوا ہے اس لیے انھوں نے مذہبی فروعات کی تشکیل جدید کو ضروری سمجھا ہے۔ تعلیمی نظام میں اصلاح تمدن کے ساتھ دوسری چیز جس پر علامہ نے زور دیا ہے وہ صنعت و حرفت کا فروغ ہے۔ تعلیمی نظام میں صنعت و حرفت کی طرف خصوصی توجہ کے ساتھ سماجی سطح پر ہنر مند افراد کی حوصلہ افزائی بھی ضروری ہے۔ یہ وہ اہم نکات ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر جاپان کی طرح ترقی کی منازل طے کی جاسکتی ہیں۔

مغربی نظام تعلیم کے حسن قبائح کو اگر اقبال کی تعلیمات کی روشنی میں ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نظام تعلیم نے انسانی کی مادی ضرورتوں کو تو بہت حد تک پورا کیا ہے مگر روحانی ضرورتوں سے پہلو تہی کی ہے ۔ کیوں کہ اس تعلیم نے آدھے انسان کی تشکیل پر توجہ صرف کی ہے اس لیے اس میں خرابی کی بہت سی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ جب تک آدمی اپنے نفس کی تسخیر نہ کرلے آفاق کی تسخیر اسے انسانیت کی معراج تک نہیں پہنچا سکتی۔ وہ جابر، قاہر،

فاشسٹ یا نازی تو بن سکتا ہے، وہ انسان نہیں بن سکتا جس کے لیے قرآن مومن کی اصطلاح وضع کرتا ہے۔ اقبال بنیادی طور پر مغربی تعلیم کے نتیجے میں مخرب المعاشرہ عناصر کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔

دراصل کسی بھی قوم کا نصابِ تعلیم اس کے تہذیب و تمدن کا ترجمان ہوتا ہے۔ اسے آسان الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وطن عزیز میں مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کے مضامین ہماری قومی تاریخ کے اعتبار سے شامل نصاب ہیں جب کہ یورپ میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے تمام سوتے قرآن و سنت سے پھوٹتے ہیں۔ لہٰذا ایسی تعلیمات کو اپنانا جو کسی قوم کی تہذیب و تمدن کی اساس سے متصادم ہوں، اس تہذیب و تمدن سے دستبرداری کی علامت ہے۔ اسی لیے اقبال کا موقف ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کسی ایک قوم کی مساعی کا مرہونِ منت نہیں بل کہ مختلف اقوم نے اپنے روایات کے مستحسن عناصر سے اس کی تشکیل کی ہے۔ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر سے درج ذیل اقتباس دیکھیے:

> "جس طرح جماعتِ مسلمین ان اختلافات کو جن کی بنا رنگ و خون پر ہو تسلیم نہیں کرتی اور دنیا کی تمام نسلوں کو انسانیت کے ہمہ گیر خیال کی مسلک میں منسلک کرنا اپنی غایت سمجھے ہوئے ہے، اسی طرح مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالم گیر ہے اور ان کا نشو و نما کسی ایک قوم کی دماغی قابلیتوں کا مرہونِ منت نہیں۔"(۱۳)

اقبال کو مغربی تعلیم پر یہ اعتراض ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان کے مسلمان اپنی قومی سیرت سے محروم ہو رہے ہیں۔ قومی سیرت سے محرومی کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیاد جس علم پر قائم ہوئی وہ مادی نوعیت کا نہیں اس کا تمام تر انحصار غیب پر ایمان پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ملت اسلامیہ کی بنیاد کوئی جغرافیائی یا مادی منفعت نہیں ہے یعنی وہ اس لیے مسلمان نہیں ہیں کہ وہ پاکستانی، ایرانی، یا افغانی ہیں بل کہ اس لیے مسلمان ہیں کہ ان کے مذہبی معتقدات ایک ہیں۔ وہ اللہ کی احدیت اور رسول اکرم ﷺ کی ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی کی تعلیم سے اسلامی تہذیب و تمدن کے تمام تر سوتے پھوٹے ہیں، یعنی خدا کی احدیت اور رسول ﷺ کی ختم نبوت پر ایمان نے ایک ایسی خاص مسلم سوسائٹی کی بنیاد رکھی ہے جس میں یہ گنجائش بدرجہ اتم موجود ہے جو اپنے بنیادی ڈھانچے میں تغیر و تبدل کیے بغیر کسی بھی قوم کے محسنات بخوبی اپنا سکتی اور مخربات کو رد کر سکتی ہے۔ اسی اسلامی تہذیب و تمدن نے دنیا میں پہلی مرتبہ تجرباتی سائنس کی بنیاد رکھی اور نفس کے ساتھ ساتھ دنیا کی تسخیر کا فریضہ اپنے پیروکاروں کو سونپا۔ اقبال کے نزدیک اس قومی سیرت سے محرومی اصل میں اپنے انفرادی ملی وجود کو مٹا کر ایک دوسری قوم میں ضم ہو جانے کے مترادف ہے۔

اسلامی تہذیب انسان کی مادی اور روحانی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے انفس و آفاق کی تسخیر کی تعلیم سے انسان کامل کی تشکیل کا فریضہ سر انجام دیتی ہے اور اس میں سے کسی ایک سے بھی پہلو تہی کو انسان کے حق میں مضرت رساں سمجھتی ہے۔ جب کہ مغرب صرف مادی ضروریات کے پیش نظر اپنی تعلیمی نظام کی نشوونما کر رہا تھا جس سے ایک ایسی تہذیب کی بناڈال دی تھی جس نے مذہب کو شخصی معاملہ قرار دے کر صرف اخلاقیات ہی کا جنازہ نہیں نکالا بل کہ تمام مغربی اقوام کو بھی آپس میں بر سرِ پیکار کر دیا۔ لیکن اقبال مسلمانوں میں اس وقت مروجہ دیسی تعلیم کے نظام سے بھی متفق نہیں تھے کیوں کہ جہاں مغرب نے روحانیت کے انکار سے اپنے تعلیمی نظام کو مخرب الاخلاق بنالیا تھا وہیں مشرق میں مادیت کو غیر اہم سمجھ کر دیسی تعلیم کو بھی غیر مفید بنالیا گیا تھا۔

بہ ہر حال اقبال کی نظر میں مغربی تعلیم سے جو نتائج سامنے آرہے تھے اسے انھوں نے "ملتِ بیضاء پر ایک عمرانی نظر" میں یوں بیان کیا ہے:

> "موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بل کل نئے اسلوب کا ماحصل ہے ۔۔۔اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے۔۔۔اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشہ میں ہر وقت سرشار ہو کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔۔۔ہمارے نوجوان کو جو اپنی قومی کی سوانح عمری سے بل کل نابلد ہے۔۔۔عقلی و ادراکی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خود داری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور لٹریچر کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔"(۱۴)

اہل ہند نے اور بل خصوص مسلمانوں نے مغربی تعلیمی نظام کو اپناتے ہوئے اس کے حسن قبائح پر نظر نہیں ڈالی اور اسے ہر عیب سمیت جوں کا توں قبول کر لیا۔ حال آں کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی قومی سیرت کے مطابق اسے ڈھال سکتے تھے بل کل اسی طرح جیسے کہ جاپانیوں نے مغربی تعلیم و تہذیب کو جاپانی بنالیا۔ اقبال کے خیال میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کی طرف بل خصوص توجہ دینے کی ضرورت تھی جو نہیں دی گئی۔ علامہ بیان کرتے ہیں:

> "ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف آج تجربہ ہم سے کرا رہا ہے، نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے اپنا ہر وقت کا رفیق

بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنالینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔"(۱۵)

اسی مضمون میں آگے چل کر فرماتے ہیں:" وہ لوگ جنھوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچے کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے وہ ہمارے مقابلے میں قوم کی ماہیت ونوعیت سے زیادہ آگاہ تھے۔"(۱۶)اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مغربی تعلیم کی بدولت مسلمانوں کا جو سب سے بڑا نقصان ہوا وہ اسلامی سیرت سے محرومی ہے۔ کیوں کہ اقبال کے نزدیک اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں تعلیم و تعلم، تہذیب وتمدن، سیاست ومعاشرت، معیشت واقتصاد کچھ بھی الگ نہیں ہے سب ایک ضابطے کے تحت ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے اسلامی سیرت سے محرومی کا مطلب اس ضابطہ حیات کو توڑ دینا ہے جو انسانیت کے لیے انتہائی خطرناک ہے اور جس کا تجربہ ہولناک جنگوں اور اخلاقی برائیوں کی صورت میں مغرب آج کر رہا ہے۔

اقبال نے یورپ میں رہ کر اہل مغرب کی تعلیم وتہذیب کے غائر مطالعے کے بعد اس کے معائب کی نشاندہی کی وہاں اس کی خوبیوں کو بھی سراہا ہے۔ اقبال کو سب سے پہلے جس چیز نے مغرب میں متاثر کیا وہ اہل مغرب کا جذبہ محنت اور قوت عمل تھی۔ اسی لیے انھوں شاعری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا مگر پھر اپنے استاد ڈاکٹر آرنلڈ کی سفارش پر مشق سخن کو اس جذبے کے ساتھ جاری رکھنے کا ارداہ کیا کہ وہ اس سے قومی تعلیم وتہذیب وتمدن کی اصلاح کا کام لیں گے۔ اس واقعے کو سر عبدالقادر نے "بانگِ دراء" کے دیباچے میں نقل کیا ہے۔ دونوں باتوں کی تصدیق "بانگِ دراء" کے حصہ دوم کی غزلیات میں شامل درج ذیل دو اشعار سے با آسانی کی جاسکتی ہے:

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے　　جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں

مذاقِ سخن نہیں ہے (۱۷)

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو　　شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

(۱۸)

اس ارادے کے ساتھ کہ وہ اپنی شاعری سے قوم کی اصلاح کا کام لیں گے انھوں نے "طلبہ ء علی گڑھ کالج کے نام" کے عنوان سے ایک نظم میں ہندوستانی طلاب کو بہت جو پیغام تعلیمی منشور کے حوالے سے دیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے مذکور نظم سے درج ذیل اشعار خاص اہمیت کے حامل ہیں:

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے — عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا — اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے
بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے ناتمام ابھی — رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی (۱۹)

درج بالا اشعار میں پہلی بات جو اقبال نے کہی وہ یہ ہے کہ تعلیم و تدریس سے متعلق ان کے خیالات دوسرے تمام متعلمین اور مدرسین سے مختلف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دل جذبہ عشق سے لبریز ہونے کے باوصف ایک ایسے درد سے بے قرار رہتا ہے جو انھیں گویا ہر دم امت مسلمہ کو درپیش مسائل کے حل کے لیے سوچ بچار پر مجبور رکھتا ہے اور دوسرے شعر میں اپنے اس مسلسل غور و فکر کا نتیجہ جو مغرب اور اہل مغرب کی تعلیم و تہذیب کے مشاہدے کے بعد اخذ کیا ہے، بیان کرتے ہوئے بتایا ہے امتِ مسلمہ کی ہر قسم کی ترقی اور ارتقاء کا دارومدار اس تعلیمی و تہذیبی نظام پر ہے جس کی بنیاد رسول کریم ﷺ نے حجاز میں رکھی اور جس کا مقام و منصب دنیا کی دیگر قوموں سے بالکل الگ ہے۔ دنیا کی دیگر قوموں نے اپنے نظمِ تعلیم و تربیت میں یا تو انسانی مادی حاجتوں کو اہمیت دی ہے یا روحانی ضرورتوں کا خیال رکھا ہے جس کے نتیجے میں ایک ادھورا اور نامکمل انسان تشکیل پا سکتا ہے۔

اس کی نسبت اسلام نے جس تعلیمی و تربیتی نظام کی بنیاد رکھی ہے اس میں آدمی کی اخلاقی تربیت اس کی مادی تربیت کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ اسلام نہ تو رہبانیت کا درس دیتا ہے اور نہ ہی نری دنیا پرستی کا۔ اسلامی تعلیمات میں انسان کو معرجِ کمال تک پہنچانے کے لیے روح اور مادہ ہر دو کو تسخیر کرنے کا ایک تربیتی نظام موجود ہے۔ تاہم آخری شعر میں انھوں نے نوجوانانِ ہندوستان کو مغربی نظام تعلیم سے مستفید ہوتے رہنے کا مشورہ دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق تعلیمی منصوبہ بندی کے لیے فضا فی الحال ساز گار نہیں ہے۔ اس لیے ہندوستانی طلباء اسی نظام سے جس حد تک ہو سکتا ہے فائدہ حاصل کریں۔ البتہ یہاں اس باریک نکتے کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کے دیسی نظام تعلیم کو "بادہ نیم رس" نامکمل شراب سے تشبیہ دی ہے اور طلاب و معلمین کے شوق کو نارسا قرار دیا ہے۔ یعنی ابھی تک نہ تو ہندوستانی مسلمانوں نے اس طرز تعلیم کی طرف پوری طرح توجہ مرکوز کی ہے جس کو اسلام

نے متعارف کرایا ہے اور جس کی بنیاد تسخیر فطرت اور تسخیر نفس پر ہے اور نہ ہی ان میں علم کے حصول کا وہ ذوق وشوق پروان چڑھا ہے جس کی بدولت دنیا میں سر اٹھا کے زندہ رہا جا سکے۔ اس صورت میں اگر صرف ہندوستان کے صرف دیسی مدارس پر انحصار کیا جائے تو اس کے نتائج خاطر خواہ نہیں ہوں گے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اقبال نے شراب کو پکانے کے لیے خم کے سر پہ "خشتِ کلیسیا" رکھنے کی بات کی ہے، نہ یہ کہ بادہ خم اور بادہ بھی کلیسیا کا ہو۔ اقبال کی مشورہ ہے کہ تعلیم اور نظام تعلیم دونوں مشرقی اور اسلامی ہوں البتہ اس کو پختہ کرنے کے لیے مغرب سے ضرورت کی حد تک استفادہ کیا جائے۔ بادہ یا شراب علم کیسی ہونی چاہیے۔ اس کے متعلق بھی اقبال "بانگِ درا" حصہ دوم میں شامل نظم "عبد القادر کے نام" کے درج ذیل اشعار سے مدد لی جا سکتی ہے:

رختِ جاں بت کدہ ءچیں سے اٹھالیں اپنا   سب کو محوِ رُخِ سُعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقہ ءلیلیٰ بیکار   قیس کو آرزوے نو سے شناسا کر دیں
بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز   جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں   (۲۰)

درج بالا اشعار پر غور کریں تو ان میں بت کدہ ءچیں ، رُخِ سعدیٰ و سلیمیٰ، ناقہ، لیلیٰ، قیس جیسی علامتوں اور استعاروں کے ذریعے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کو غیر اسلامی تہذیب و تمدن کی بجائے مکمل طور پر عربی تہذیب و تمدن کی طرف منھ موڑ لینا چاہیے۔ البتہ دنیا میں تجرباتی سائنس کے سبب تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کو نظر میں رکھ کر اپنا لائحہ عمل طے کرنا چاہیے مثال کے طور پر پہلے دور میں لیلیٰ اونٹ پر سفر کرتی تھی آج کی لیلیٰ ریل، کار یا ہوائی جہاز پر سفر کرے گی، جیسے کہ عثمانی ترکوں نے حاجیوں کی سہولت کے لیے شام سے حجاز تک ریلوے لائن بچھا دی تھی، اس لیے تعلیم کے طریقے میں بھی دورِ جدید کے اعتبار سے تبدیلی ضروری ہے۔ محبوب وہی رہنا چاہیے صرف عشق کے انداز میں تبدیلی ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کو روایتی تعلیمی طریقوں کی بجائے جدید طریقے اپنانے کی ضرورت ہے۔ البتہ اس میں یہ خیال رکھنا اشد ضروری ہے کہ تعلیم مغربی تہذیب کی نہیں ہونی چاہیے، تہذیبی و ثقافتی طور پر مسلمان اپنی قدیم تعلیم سے جڑے رہیں اور اس میں خود کو مکمل طور پر رنگ کے ترقی کی منازل طے کریں۔

ہندوستان کا نوجوان اصل میں اس کے علم و فن کی بجائے اس کی تہذیب و تمدن کو سولائزیشن سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھا اور اقبال یہ بات باور کرانا چاہتے تھے کہ فرنگی تہذیب و تمدن تو مخرب الاخلاق اور فساد فی الارض کا حامل ہے ۔یورپ کی دنیاوی ترقی علم و فن کے ذوق و شوق کی وجہ سے ہے۔ اس لیے ایسا نظام تعلیم ترتیب دینے کی ضرورت ہے جس

میں ان کے تہذیب و تمدن کی تحریک و تشویق کی بجائے، علم و فن میں ان کے تجربوں سے ویسا ہی فائدہ اٹھانا چاہیے جیسا کہ انھوں نے اپنی نشاۃ الثانیہ کے لیے مسلم سائنسدانوں کے تجربوں سے اٹھایا ہے۔ "جاوید نامہ" سے درج ذیل اشعار دیکھیے:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب　　نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

نے ز سحر ساحرانِ لالہ روست　　نے ز عریاں ساق و نے از قطع موست

محکمی اور رانہ از لادینی است　　نے فروغش از خطِ لاطینی است

قوتِ افرنگ از علم و فن است　　از ہمیں آتش چراغش روشن است (۲۱)

ترجمہ: مغرب کی قوت کا راز ساز اور باجوں یا بے پردہ خواتین کی رقص سرود کی محفلوں میں نہیں ہے۔ نہ ہی سرخ و سفید رنگت والی جادو گر عورتوں کی وجہ سے ہے جن کے بال ترشے ہوئے اور پنڈلیاں برہنہ ہیں۔ نہ اس وجہ سے کہ انھوں نے لاطینی رسم الخط کو فروغ دیا ہے یا دین کو ترک کر دیا ہے۔ ان کی قوت کا اصل راز ان کے ذوق علم و ہنر کی وجہ سے ہے اور اسی آگ سے ان کا چراغ روشن ہے۔

اہلِ ہند نے مغربی تہذیب کی تو پوری طرح پیروی کرنے کی کوشش کی مگر علوم و فنون کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حالا آں کہ اہل مغرب نے ہندوستان کو اپنی جدید ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر فتح کیا تھا۔ لیکن مسلمانوں اس سے سبق حاصل کرنے کی بجائے لارڈ میکالے کی سازش کا شکار ہو گئے جس نے تعلیم کا مقصد نوکریوں کا حصول قرار دے کر ایک طرف تو کلرکوں کی ایسی فوج تیار کرنے کی بنیاد ڈالی جو برطانوی افسروں کے ماتحت دفتری کاموں میں معاونت کرے اور دوسرے اس تعلیم کے ذریعے ہندو مسلم تعلیم و تہذیب کے لیے حقارت کا جذبہ پیدا کر کے ایسے بے دام غلام پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی جو اپنے انگریز آقاؤں کے حکم پر وطن اور اہل وطن کا گلا کاٹنے کے لیے ہر دم مستعد رہیں۔ بہر حال مغربی تعلیم کا جو نتیجہ ہندوستان میں برامد ہوا وہ یہ تھا کہ کہ مشرقی اقوام جدید تعلیم کو اپنانے کے باجود اپنی انفعالیت پر قابو نہیں پا سکیں کیوں کہ من حیث القوم ہمارا رجحان مغربی تعلیم سے زیادہ ان کے تہذیب و تمدن کی طرف رہا۔ ہمارے ہاں آج بھی تعلیم فہم و ادراک اور خودی کے استحکام سے زیادہ، میکالے کی فرعونی حکمت کے زیر اثر، کسب معاش کا ذریعہ ہے۔

اقبال اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جدید دور میں سائنسی تعلیم کے سلسلے میں مغرب نے ہماری رہنمائی کی ہے لیکن وہ اس بات پر تاریخی حقائق کی روشنی میں مصر ہیں کہ اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ "

مسلمانوں کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز پار فتار کے قدم باقدم چلنا چاہیے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو۔"(۲۲) اقبال نے ہندوستان میں رائج تعلیمی نظام کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ الندوہ، علی گڑھ کالج، مدرسہ دیوبند اور اس طرح کے دوسرے مدرسے الگ الگ دائروں میں کام کر رہے ہیں جب کہ:

> "بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلم ہونا چاہیے جہاں افرادِ اقوم نہ صرف خاص قابلیتوں کا نشوونما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بل کہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جاسکے جس میں زمانہء موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا چاہیے، پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی داالعلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم وجدید کی آمیزش دل کش انداز سے ہوئی ہو۔"(۲۳)

اقبال کے نزدیک اقتصادی اور سیاسی قوتیں دنیا میں جس طرح عمل پیرا ہیں، اس میں کسی دوسری قوم کے تمدن کے عناصر کا اخذ و جذب قرینِ مصلحت ہی نہیں بل کہ بعض صورتوں میں لازم ہے لیکن اگر اس کو اپنانے میں محض تقلید سے کام لیا گیا تو یہ قومی زندگی کے لیے نہایت نقصان دہ ہو گا۔ اس لیے ضروت اس امر کی ہے کہ دوسری قوموں کے تہذیب و تمدن کے اہم عناصر کو محاسن و معائب کی کڑی کسوٹی سے گزارنے کے بعد تعلیم و تعلم کے ذریعے نفوذ کی اجازت دی جائے۔ یعنی صرف انھی عناصر کو فروغ دیا جائے جو مسلم قومت کی معاشی، تمدنی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی زندگی میں ارتقا کا باعث بنیں نہ اخلاق کی خرابی اور ذہنی و جسمانی غلامی کو فروغ دیں۔ ہمارے ماہرین تعلیم اور نصاب ساز مصور پاکستان کے تعلیمی نظریات کو پیش نظر رکھ کر قوم کے لیے تعلیم و تعلم اور اخلاقی تربیت کا لائحہ عمل طے کریں تو یقیناً اس سے نہ صرف بہتر تعلیمی نتائج حاصل ہوں گے بل کہ ایک ایسی خود دار اور غیور نسل پروان چڑھے گی جو انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر طور پر اقوام عالم میں اپنی مہارت اور قابلیت کا لوہا منوا سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ذوالفقار، غلام حسین، پروفیسر، ڈاکٹر، "اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء"، (لاہور: بزم اقبال، اکتوبر/ ۱۹۹۸ء)، ص: ۱۶۔۱۷

۲۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، "سرگذشتِ اقبال"، (لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۹۶ء)، ص: ۴۰

۳۔ ذوالفقار، غلام حسین، پروفیسر، ڈاکٹر، ص: ۳۳

۴۔ جاوید اقبال، "زندہ رود (حیاتِ اقبال کا وسطی دور)"، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۱ء)، ص: ۸۔۹

۵۔ محمد حبیب الدین، "اقبال کا نظریہ تعلیم"، ص: ۴۳

https://www.rekhta.org/ebooks/allama-iqbal-ka-nazriya-e-taleem-mohammad-habibuddin-ebooks، بتاریخ ۱۳ اپریل ۲۰۲۲ء ۳ بجے سہ پہر

۶۔ ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ"، (لاہو: اقبال اکادمی، طبع سوم، ۲۰۱۰ء)، ص: ۴۱۵

۷۔ ایضاً، ص: ۴۱۰

۸۔ ایضاً

۹۔ برنی، سید مظفر حسین، "کلیاتِ مکاتیبِ اقبال" جلد دوم (جنوری ۱۹۱۹ء تا دسمبر ۱۹۲۸)، (جہلم: بک کارنر، فروری/ ۱۹۱۶ء)،
ص: ۳۲۲

۱۰۔ اقبال، "بچوں کی تعلیم و تربیت" مشمولہ "مقالاتِ اقبال" مرتبہ عبدالواحد معینی (لاہور: شیخ محمد اشرف پرنٹر پبلشرز، مئی/ ۱۹۶۳ء)، ص: ۱۔۹

۱۱۔ ایضاً، مضمون، "قومی زندگی"، ص: ۵۰

۱۲۔ ایضاً، ص: ۶۱

۱۳۔ ایضاً، مضمون، "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر"، ص: ۱۲۵

۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۳۲

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۳۳

۱۷۔ اقبال، "کلیاتِ اقبال (اردو)"، (لاہور: اقبال اکادمی، اشاعت ششم، ۲۰۰۴ء)، ص:۱۶۲

۱۸۔ ایضاً، ص:۱۶۸

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۴۰

۲۰۔ ایضاً، ص:۱۴۲

۲۱۔ اقبال، "کلیات اقبال فارسی"، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلیشرز، فروری، ۱۹۷۳ء)، ص:۷۶۶

۲۲۔ اقبال، مضمون، "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر"، ص:۱۳۴

۲۳۔ ایضاً، ص:۱۳۵